"عورت، صرف ایک جسم نہیں،
بلکہ ایک کامل انسان ہے۔
اس کی آزادی، اس کی شخصیت اور
اس کی فکر ہے۔"

مسلم خاتون سے توقعات

ڈاکٹر علی شریعتی



عورت کی شخصیت، آزادی، ذمہ داری اور معاشرتی کردار پر ایک فکر انگیز مطالعہ

مسلم خاتون سے توقعات

اپنے لیکچر کے آغاز سے قبل، میں کچھ عملی تجاویز پیش کرنا چاہتا ہوں۔ خواتین کے حقوق، خواتین کی شخصیت اور اسلام کے خواتین سے متعلق نقطه نظر کے بارے میں بات کرنا، اسلام کی طرف سے انسانوں، اور خاص طور پر خواتین کو دیے جانے والے حقیقی مقام کے ادراک سے کافی مختلف ہے۔ اکثر ہم صرف یہ کہہ کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ اسلام سائنس کو بڑی اہمیت دیتا ہے یا خواتین کے لیے ترقی پسند حقوق قائم کرتا ہے۔ بدقسمتی سے ہم ان اقدار یا حقوق سے کبھی بھی فائدہ نہیں اٹھاتے۔ اگر ہم ان سے حاصل کردہ سمجھ بوجھ کے مطابق عمل کریں تو ہم ان سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

بہت سے لوگ اسلامی معاشرتی نظریات، سماجی تعلقات، خواتین کے حقوق، بچوں کے حقوق اور خاندانی حقوق سے واقف ہیں، لیکن یہی لوگ پھر غیر اسلامی، قدیم ثقافتی روایات کی پیروی کرتے ہیں اور اپنی زندگیوں کو اسلامی اقدار پر استوار کرنے کی ہمت نہیں کرتے۔ یعنی وہ اپنی کہی ہوئی باتوں پر عمل نہیں کرتے۔ اس طرح ہم ہمیشہ صرف باتوں کی حد تک محدود رہتے ہیں۔

ہمیں اسلامی نظریات اور فکری بحثوں کو عملی حل کے ساتھ مکمل کرنا ہوگا۔ ہمیں کوئی ایسا طریقہ تلاش کرنا ہوگا جس سے ہم ان اقدار اور حقوق کو عملی طور پر حاصل کر سکیں۔ میرے نظریات پیش کرنے کے بعد، یہ سوال اٹھنا چاہیے کہ ہم انہیں عملی طور پر کیسے نافذ کر سکتے ہیں؟

تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ خواتین کے حقوق اور ان کے کردار کا مسئلہ ہمیشہ ایک فکری مسئلہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ چنانچہ، مختلف مذہبی، فلسفیانہ اور سماجی نظاموں نے اس حوالے سے مختلف نظریات اپنائے ہیں۔

اٹھارویں صدی سے لے کر بیسویں صدی تک (خاص طور پر دوسری جنگ عظیم کے بعد) خواتین کے سماجی حقوق اور ان کی مخصوص خصوصیات کے مسئلے کو حل کرنے کی ہر کوشش کو روحانی یا نفسیاتی صدمے کے ضمنی پیداوار، یا تعلیمی

مراکز میں انقلابی بحران کا نتیجه، یا سیاسی دھاروں اور بین الاقوامی تحریکوں کے ردعمل کے طور پر دیکھا گیا ہے۔ چنانچه، روایتی معاشرے، تاریخی معاشرے، مذہبی معاشرے، خواہ مشرق میں ہوں یا مغرب میں (خواہ وہ قبائلی ہوں، بدوی ہوں، مہذب ہوں، مسلم ہوں یا غیر مسلم، تہذیب کے کسی بھی سماجی یا ثقافتی مرحلے پر ہوں) یه سب براہ راست یا بالواسطه طور پر ان خیالات، فکری دھاروں اور یہاں تک که نئی سماجی حقیقتوں سے متاثر ہوئے ہیں۔

بدقسمتی سے خواتین کی آزادی کا بحران، جو مغرب سے شروع ہوا اور جسے بیسویں صدی میں حکمراں سپر پاورز نے تقویت دی، نے تمام انسانی معاشروں، یہاں تک که بند روایتی اور مذہبی معاشروں کو بھی متاثر کیا ہے۔ بہت کم ایسے ثقافتی، روایتی اور مذہبی معاشرے ہیں جو اس سیلاب کے سامنے ٹھیک طرح سے کھڑے ہو سکے ہیں۔

ایسے معاشرے اکثر ایک عجیب و غریب جدیدیت سے نبرد آزما رہے ہیں جسے انہوں نے خواتین کی آزادی کی آڑ میں اپنایا ہے، یا تو پرانی روایات کو مسترد کر کے یا اندھی جدوجہد کر کے۔ ان میں سے کوئی بھی اس حملے کے سامنے کھڑا ہونے میں کامیاب نہیں ہوا۔

ایسے معاشروں میں نئی تعلیم یافته کلاس، یعنی نیم دانشور، جو اکثریت میں ہیں، اس بحران کا پرجوش استقبال کرتے ہیں۔ وہ خود اس کرپٹ اور تباہ کن تبدیلی کو تقویت دینے والی قوتوں میں سے ایک کے طور پر کام کرتے ہیں۔

روایتی مذہبی معاشروں میں، بشمول اسلامی برادریوں کے، کوئی بھی گروہ مغرب کی طرف سے اعلان کردہ خواتین کی آزادی کے جدید نظریے کے حملے کے سامنے کھڑا نه ہو سکا۔ اسلامی اور غیر اسلامی معاشروں کے مشرقی نیم دانشوروں اور جدید طبقے نے باوقار لباس کو جدید تہذیب، ترقی اور شعور کی علامت سمجھا۔ پرانے، روایتی گروہ نے تجربے کی کمی کے باعث غیر سائنسی اور غیر منطقی حربوں کے ساتھ اس بحران کا سامنا کیا۔ یه ایک عام قانون ہے که جب تیل گرنے سے آگ لگ جائے، تو اگر کوئی اسے جلدی اور اناڑی پن سے بجھانے کی کوشش کرے، تو وہ اور تیزی سے اور شدت سے پھیلتی ہے!

چنانچہ مغرب کے خلاف ایسی اناڑی جدوجہد اکثر اس انداز میں کی گئی جس نے ایسے معاشروں کے اندر احساسِ کمتری اور مختلف ردعمل پیدا کیے ہیں۔ اس طرح انھوں نے مغربی نظریات اور ایجادات کو قبول کرنے کی راہ ہموار کی ہے۔ بہت کم ایسے معاشرے ہیں جو مغرب کے سامنے کھڑے ہونے، مناسب مزاحمت کرنے اور اپنے طرز زندگی کے انتخاب کے ذریعے ایک موثر ردعمل دکھانے کے قابل ہوئے ہیں۔

مشرقی معاشروں کو مغرب کے فکری اور ثقافتی حملے (جیسا کہ اس کا تعلق جدید عورت کے نقطہ نظر سے ہے) کا مقابلہ کرنے اور کھڑے ہونے میں مدد دینے والے اہم ترین عوامل میں سے ایک، تجربات، اقدار اور خیالات سے بھرپور ایک امیر ثقافت اور تاریخ کا ہونا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ ترقی پسند انسانی حقوق حاصل ہوں اور خاص طور پر، ان معاشروں اور برادریوں کی مذہبی تاریخ میں کامل اور مکمل انسانی نمونے موجود ہوں۔

خوش قسمتی سے اس نقطہ نظر سے (اگرچہ وہ مغرب کے نوآبادیاتی حملے کے خلاف شعوری طور پر کھڑے ہونے کے قابل نہیں رہے ہیں)، اسلامی معاشروں کے پاس ثقافتی طاقت اور امکانات موجود ہیں، ان کی تاریخ، اقدار کا نظام اور مذہب بہت ترقی پسند ہے اور اس طرح وہ بہت امیر ہیں۔ چنانچہ، وہ ان اقدار اور ذرائع پر انحصار کر کے، اور اپنی ثقافت اور ماضی کی تاریخ میں موجود اعلیٰ انسانی اقدار کو زندہ کر کے اور ان کی جانب پیش قدمی کر کے اپنی نئی، نوجوان نسل کو مغرب کے حملے کے خلاف مزاحمت کی ترغیب دے سکتے ہیں۔

مغربی اقدار کا مقابلہ کرنے کے لیے سب سے موثر ہتھیار اور ہماری اسلامی معاشروں کی نئی نسل کے اندر مغرب کی فریب کاریوں کے خلاف شعوری جدوجہد پیدا کرنے کے لیے سب سے اہم عنصر یہ ہے کہ اسلامی تاریخ کی بہت اعلیٰ، ممتاز اور مخصوص علامتوں اور حقیقی شخصیات کو سامنے لایا جائے۔ اگر ایسی شخصیات کی زندگیاں تفصیل سے معلوم ہوں، درست طریقے سے دکھائی جائیں، زندہ کی جائیں اور مناسب طور پر، سائنسی انداز میں، شعوری طور پر، تعلیمی لحاظ سے پہچانی جائیں اور ہمارے معاشروں کے سامنے پیش کی جائیں، تو نوجوان نسل یہ محسوس کرے گی کہ مغرب کی فریب کاریوں کو قبول کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، جدیدیت کی آڑ میں زوال پذیر ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بلکہ،

وہ یہ محسوس کریں گے کہ ان کی اپنی تاریخ اور مذہب میں بہت اعلیٰ، بلند علامتیں موجود ہیں جن کی پیروی کی جانی چاہیے اور جنہیں خود کی تعمیر نو کے لیے ماڈل سمجھا جانا چاہیے۔

اس بات کو مدنظر رکھا جانا چاہیے کہ خواتین، سائنس، طرز زندگی، طبقاتی تعلقات، تعلیمی سمجھ بوجھ، انسان کے عالمی نقطہ نظر سے متعلق تمام امور اسلام میں ڈیزائن، بیان اور زیر بحث لائے گئے ہیں۔ ہمیں صرف اپنی موجودہ مشکلات کو حل کرنا ہے، فکری چیلنجوں کا جواب دینا ہے، اور اپنی حسی ضروریات کو کم کرنا ہے۔ ہم اپنی اقدار کو کیسے سمجھ سکتے ہیں؟ ہم ان کا استعمال کیسے کر سکتے ہیں اور ان سے حقیقی نتائج کیسے حاصل کر سکتے ہیں؟ ہمارا بنیادی مقصد مناسب سمجھ بوجھ اور پہچان کے مسئلے کو حل کرنا ہونا چاہیے۔

پیغمبر اکرم (ص) کے اہل بیت کے اراکین، تمام اسلامی ممالک کے دانشوروں کی نظر میں (جو ان کا زیادہ ممتاز تصور رکھتے ہیں)، ہمیشہ سب سے بلند اور آزاد کرنے والی انسانی اور اسلامی اقدار کا مظہر رہے ہیں۔ یہ اقدار کسی خاص قبیلے یا صرف تمام مسلمانوں تک محدود نہیں ہیں۔ لہٰذا، دنیا کے تمام لوگ ان علامتوں اور مثالوں کو آسانی سے دیکھ اور سمجھ سکتے ہیں جو ایک ایسے چھوٹے سے گھر سے نکلے ہیں جو پوری تاریخ سے بڑا ہے۔

جو کوئی بھی انسانیت کی اقدار اور فضیلتوں پر یقین رکھتا ہے وہ تسلیم کرے گا کہ مختلف جہتوں اور میدانوں میں اس خاندان کا علامتی کردار طبقاتی یا قبائلی تاریخی اقدار سے بالاتر ہے۔ وہ بلکہ اعلیٰ ترین، ماورائے تاریخ، ماورائے قبیلہ اقدار ہیں۔ وہ انسانیت کی مستقل علامتیں اور مثالیں ہیں۔

چنانچہ، جو کوئی بھی انسان ہے وہ ان کا احترام کرتا ہے۔ جو کوئی بھی انسانیت کی اقدار سے واقف ہے، دنیا کا کوئی بھی پرعزم دانشور، ان اقدار اور فضیلتوں کو تسلیم کرے گا جو اس چھوٹے سے گھر نے انسانی تاریخ کے میدان میں پیدا کیں۔

لہذا، جب ہم فاطمہ (س) کی سوانح عمری بیان کرتے ہیں، تو ہمیں بطور پیغمبر اکرم (ص) کے خاندان کے ایک رکن کے، ان کی شخصیت، ان کے کردار، ان کی

سماجی، ذہنی اور سیاسی حیثیت سے سبق سیکھنا چاہیے اور انہیں اپنے گروہوں اور معاشروں میں اپنی زندگیوں کی رہنمائی کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔

مناسب سمجھ بوجھ کا مسئلہ ہمارے وقت کا سب سے اہم اور ضروری مسئلہ ہے۔ موجودہ وقت میں، پرعزم مسلمان دانشوروں کی جدوجہد اسلام کی تاریخ اور مذہب کی مناسب سمجھ بوجھ اور پہچان کی طرف مرکوز ہونی چاہیے۔ یہ مناسب سمجھ بوجھ، بشمول فاطمہ (س) کی مناسب سمجھ بوجھ، ہماری نجات کی کلید ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد، مغرب میں عورت کے مسئلے کو سب سے اہم اور حساس مسئلہ قرار دیا گیا۔ جنگ بذات خود خاندانی تعلقات کے ٹوٹنے اور تباہ ہونے کی بنیادی وجہ تھی۔ روایتی مذہبی اقدار جیسے اخلاقیات، آداب اور روحانیت ختم ہو گئیں۔ نیز، جنگ کی وجہ سے جرائم، ظلم، جارحیت اور لوٹ مار میں اضافہ ہوا۔

فکری اور اخلاقی نقطہ نظر سے، اس کے بہت متنوع اثرات مرتب ہوئے، جس سے جنگ کے بعد کی نسل زوال کا شکار ہوئی۔ ایک چوتھائی صدی [دوسری جنگ عظیم کے بعد] کے بعد اس کے منحوس اثرات کو موجودہ دور کی روح، سوچ، فلسفے اور یہاں تک کہ فن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

جن لوگوں نے فرانس، جرمنی، انگلینڈ اور یہاں تک کہ امریکہ [جس میں سے مؤخر الذکر میدان جنگ سے بہت دور تھا] کو جنگ سے قبل دیکھا ہے اور جنگ کے بعد ان ممالک کا دورہ کیا ہے، وہ واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں کہ، اگرچہ ایسا لگتا ہے جیسے صدیاں گزر چکی ہیں، درحقیقت ثقافتیں ایک نسل کے اندر ہی تباہ ہو گئیں۔ لہذا، اخلاقی اقدار کا زوال جنگ کے فطری نتائج میں سے ایک تھا، اور عورت اس کی حامل تھی۔

لیکن یہ نکتہ نوٹ کیا جانا چاہیے کہ جنگ سے قبل، مغرب پہلے ہی کیتھولک مذہب (جو قرون وسطیٰ میں حکمران مذہب تھا) کے ساتھ فلسفیانہ، ذہنی، سماجی، پیداواری اور ثقافتی نقطہ نظر سے کثیر جہتی لڑائی شروع کر چکا تھا، اور اس طرح لاشعوری طور پر تمام اخلاقی، فکری اور مثالی اقدار کو، نیز ان پابندیوں اور حدود کو جن کا چرچ نے مذہب کے نام پر دفاع کیا تھا، تباہ کر چکا تھا۔

ان اقدار میں سے ایک جن کا چرچ نے مذہب کے نام پر دفاع کیا، خواتین کے حقوق اور خواتین کی اقدار تھیں، روحانی اور سماجی دونوں لحاظ سے۔ اس دفاع کے ساتھ زوال پذیر، عورت مخالف روایات، بندھن اور محدودیتیں شامل تھیں۔

لیکن نشاۃ ثانیہ اور بورژوازی (سرمایہ دارانہ طبقے) کی ترقی کے بعد، بورژوا انقلاب، بورژوا ثقافت جو کہ انفرادی آزادی کی ثقافت ہے، نے چرچ کو شکست دی اور نتیجے کے طور پر، اس فتح کے ساتھ، اخلاقی، روحانی، تعلیمی اور قانونی اقدار پر چرچ کی حکمرانی ختم ہو گئی۔ چنانچہ، خواتین سے متعلق تمام پابندیاں اور اقدار جن کا چرچ نے مذہب کے نام پر دفاع اور حمایت کی تھی، بورژوازی کے عروج اور اس کی ثقافت کے سامنے دم توڑ گئیں۔

پھر اچانک جنسی آزادی کا مسئلہ ظاہر ہوا۔ خواتین نے محسوس کیا کہ جنسی آزادی کے نعرے کے ذریعے، تمام انسان مخالف حدود، پابندیاں اور بندھن جو انہیں روکتے تھے، تباہ کیے جا سکتے ہیں۔ خواتین نے اس تبدیلی کا اس حد تک پرجوش استقبال کیا کہ جنسی آزادی سائنس کے میدان میں داخل ہو گئی!

جسے عام طور پر مذہب کی سائنسی سمجھ بوجھ کہا جاتا ہے، وہ خالص سائنسی اور تعلیمی سمجھ بوجھ نہیں ہے۔ یہ بلکہ ایک بورژوا شناخت ہے۔ قرون وسطیٰ کے بعد، سائنس جو مذہب اور چرچ کی خدمت میں تھی، اسے موجودہ حکمران بورژوا نظام کی خدمت پر لگا دیا گیا۔ اگر آج کل سائنس مذہب اور اخلاقی اقدار کی مخالفت کرتی نظر آتی ہے، تو یہ درحقیقت سائنس نہیں ہے جو ان کی مخالفت کرتی ہے، بلکہ یہ حکمران بورژوا نظام ہے جو ایسا کرتا ہے؛ بالکل اسی طرح جیسے قرون وسطیٰ میں جاگیرداری تھی جو مذہب کے نام پر اشرافیہ کی سماجی و اخلاقی روایات کا دفاع کرتی تھی۔ یہ عیسائیت تھی جو درحقیقت جاگیرداری کا دفاع کر رہی تھی، اور اب یہ سائنس ہے جو درحقیقت بورژوازی کا دفاع کرتی ہے۔ وہ دانشور جو یہ مانتے ہیں کہ معاشی اور مادی سماجی بنیادیں تمام سماجی تبدیلیوں کی بنیاد ہیں، وہ میری دلیل اور منطق کو زیادہ آسانی سے قبول کریں گے۔

فرائیڈ (جو بورژوازی کے ایجنٹوں میں سے ایک ہے) کے ظہور تک، یہ آزاد خیال بورژوا روح کے ذریعے ہی تھا کہ سائنسی جنسییت کا اظہار ہوا تھا۔ یہ بات مدنظر رکھی جانی چاہیے کہ بورژوازی ہمیشہ ایک کمتر طبقہ ہے۔ اگرچہ جاگیرداری ایک انسان مخالف نظام تھا، لیکن اس کے باوجود، اس کا انحصار ایک اشرافیہ کے طبقے اور ان کی اخلاقی اقدار پر تھا، حالانکہ یہ اخلاقی اقدار زوال کا باعث بنیں۔ بورژوازی کی ذہنیت تمام اعلیٰ، صعودی انسانی اقدار کی نفی کرتی ہے اور پیسے کے سوا کسی چیز پر یقین نہیں رکھتی۔

چنانچہ، ایک عالم یا سائنسدان جو بورژوا دور میں رہتا ہے، سوچتا ہے اور مطالعہ کرتا ہے، اجتماعی ثقافتی اور روحانی اقدار (نوع انسانی کی قربانیاں، شہادتیں، جدوجہد، ادب، فن وغیرہ) کو صرف ننگی معیشت کے پیمانے سے، پیداوار اور کھپت سے، اور کسی اور چیز سے نہیں ناپتا۔ جو نفسیات یا بشریات کا مطالعہ کرتا ہے، انسان کی صوفیانہ روح کے تمام پہلوؤں اور مظاہر کو دیکھتا ہے (جسے مذہب خدا کی روح اور مابعد الطبیعیاتی فضیلتوں کا مظہر مانتا ہے) تو اسے صرف غیر مطمئن جنسی بھوک دکھائی دیتی ہے۔ عقیدہ، ثقافت، ذہنی بیماریاں سب ایک قید اور مجرمانہ جنسی کمپلیکس کو آزاد کرنے کی جدوجہد سے متعلق ہیں۔ بورژوا سماجی سائنسدان انسان کے تمام نازک احساسات اور جذبات (یہاں تک کہ ماں کا بچے کو پیار کرنا، عاشق کی طرف سے معشوق کی پوجا اور دیگر تمام مسائل) کو جنس کے تعلق سے دیکھتا ہے۔

فرائیڈ، ایک جدید بورژوا، نے تمام اخلاقی اور انسانی اقدار کے خلاف، انسانی روح کے تمام اعلیٰ اور صعودی مظاہر کے خلاف خود کو مسلح کیا اور اسے حقیقت کا نام دیا۔ فرائیڈ کی "حقیقت پسندی" (realism) بورژوازی کی نہیں، پسندی بلکہ اس سائنسدان، عالم، فلسفی، ماہر نفسیات اور بشریات کے ماہر کی تھی جو بورژوا طبقے کی خدمت کرتے ہیں؛ کیونکہ یہ سب انسان کو جنسی اور معاشی جانور کی سطح پر لے آتے ہیں! چنانچہ، بورژوازی نے تمام اقدار اور فضیلتوں کو اجنبی بنا کر، اس دور کے تمام دکھی انسانوں کے لیے صرف ایک مذہب، ایک مکتب، ایک مندر اور ایک پیغمبر بنایا جس پر سب کچھ قربان کر دینا چاہیے۔

اس پیغمبر کا نام فرائیڈ تھا۔ اس کا مذہب جنس تھا۔ اس کا مندر فرائیڈیت تھا، اور پہلا شخص جسے اس مندر کی دہلیز پر قربان کیا گیا وہ عورت اور اس کی انسانی اقدار تھیں۔

ہم جو مشرق میں رہتے ہیں ہمیشہ مغربی نوآبادیات کے بارے میں بات کرتے ہیں، لیکن میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مغربی نوآبادیات صرف مشرق کو نوآبادیاتی بناتی ہے یا لوٹتی ہے۔ یہ ایک عالمی طاقت اور طبقہ ہے جو مشرق اور مغرب دونوں کو لوٹتا اور نوآبادیاتی بناتا ہے۔

اگر مجھے موقع ملتا، تو میں یہ بتاتا کہ اس طاقت نے یورپی عوام کو مشرقی عوام سے بھی زیادہ اجنبی بنا دیا ہے۔ یورپی نوآبادیات کی بے روزگاری اور بدحالی کی میراث کے قیدی بن چکے ہیں اور مستقبل میں بھی رہیں گے۔ وہ نوآبادیات مخالف کے شکار کے طور پر جاری رہیں گے۔ یہ حکمران نوآبادیاتی طاقت مشرقی لوگوں کو کئی طریقوں سے متاثر کرتی ہے جیسے: غیر اہم، سنسنی خیز اور جذباتی معاملات پر زور؛ افواہیں، امتیاز اور منافقت؛ اور مشرقی باشندوں کو دنیاوی اور غیر اہم مسائل میں مصروف رکھنے کے لیے تفرقہ اور مایوسی کا بیج بونا۔ ان ذرائع سے مشرقی باشندوں کو ایسی حالت میں رکھا جاتا ہے کہ وہ اس بات سے بے خبر رہیں کہ مغربی نوآبادیات ان کے ساتھ کیا کر رہی ہے، اپنے انجام اور تقدیر سے بے خبر رہیں۔ یہ سازشیں، پھر، نوجوان یورپیوں کو بھی اجنبی اور تباہ کن بننے، اور مزید کرتب اور جرائم کرنے کا باعث بنتی ہیں۔ یہ تمام کام مشرقی ممالک میں نوآبادیات کے نام پر کیے جاتے ہیں بغیر اس کے کہ مشرقی باشندوں کو اس کا احساس ہو.......

مثال کے طور پر، ہم سب ایک وسیع بین الاقوامی پولیس نیٹ ورک اور ان وسیع انٹیلی جنس سروسز کے بارے میں جانتے ہیں جو دنیا میں کہیں بھی ہونے والی معمولی ترین نقل و حرکت پر بھی نظر رکھتی ہیں۔ اور پھر بھی، منشیات کے ٹنوں کے حساب سے ڈھیر ہیں جو آزادانہ طور پر مشرق سے مغرب منتقل ہوتے ہیں۔ انہیں بڑی بین الاقوامی تنظیمیں تقسیم اور فروخت کرتی ہیں اور انہیں اپنی فیکٹریوں، طیاروں، بندرگاہوں، جہازوں اور دفاتر کے ذریعے منتقل کرتی ہیں۔ ایسا کیوں ہے کہ بین الاقوامی پولیس یورپ اور امریکہ کی نوجوان نسل میں منشیات

کی تقسیم کو روک نہیں سکتی؟ کیوں؟ اس لیے کہ حکمراں قوتیں نوجوان نسل کو یہ سمجھنے سے روکتی ہیں کہ یورپ اور امریکہ میں کیا ہو رہا ہے؟ حکمراں قوتیں انہیں اس بات کی پرواہ کرنے سے روکتی ہیں کہ انسانیت کی تقدیر اور مقدر پر کون حکمرانی کرتا ہے۔ یہ وہی حکمراں طاقت ہے جو مغرب اور مشرق دونوں کو نوآبادیاتی بناتی ہے، صرف اس کے طریقے اور تعلقات مختلف ہیں۔ بہر حال، مشرق اور مغرب دونوں میں، انسان اس انسان دشمن عالمی طاقت کے شکار ہیں۔

اس حکمراں طاقت کی طرف سے فکری، سماجی، معاشی اور اخلاقی نقطہ نظر سے تخلیق کردہ اہم ترین ذرائع میں سے ایک 'فرائڈین جنسییت' (Freudian sexualism) ہے۔ یہ ہمارے دور کی مشترکہ سماجی روح بن چکی ہے اور تمام اقدار، فضیلتوں اور آزادیوں کا متبادل بن گئی ہے۔

یہ اتفاق نہیں ہے کہ فرائیڈ کا جنسییت کا نظریہ دوسری جنگ عظیم کے بعد منظر عام پر آیا اور فن کی بنیادی بنیاد بن گیا۔ زیادہ تر فلمیں صرف دو عناصر پر مبنی ہیں: تشدد اور جنسییت۔ یہ دونوں جنگ کی باقیات ہیں۔ موشن پکچرز (فلمیں) مغربی سرمایہ داری کے ساتھ فن کے تعلق کی اہم ترین مثالوں میں سے ایک ہیں کیونکہ فلم پروڈکشن واحد فن ہے جو سرمائے کی مدد کے بغیر موجود نہیں رہ سکتا اور نہ ترقی کر سکتا ہے۔ اس طرح یہ مصوری، ادب، شاعری اور موسیقی کے فنون سے مختلف ہے۔ ایک غریب مصور، مصنف، شاعر یا موسیقار فن کا عظیم ترین شاہکار تخلیق کر سکتا ہے، لیکن ایک فلم پروڈیوسر کو فروخت کے قابل فلم بنانے کے لیے لاکھوں ڈالر کے سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس طرح، یہ فن لاشعوری طور پر سرمایہ داری کی حمایت کر رہا ہے۔

تیسری اور چوتھی دنیا کے نیم دانشور اور نیم علماء یہ سمجھتے ہیں کہ فرائڈیت (Freudism) واقعی موجودہ دور کی سائنس ہے۔ جدید علماء فرائیڈ کے کاموں پر ایک خاص انداز میں تحقیق اور ریکارڈ کرتے ہیں۔

یہ دلچسپ بات ہے کہ پسماندہ ممالک میں، دانشوری اور جدید سائنسی نفسیات کی آڑ میں، علماء اور سائنسدان ان آفاقی قوتوں کی مفت خدمت کرتے ہیں۔ سائنس کے نام پر، وہ دانشوروں اور نوجوان نسل کے درمیان آزادانہ طور پر انسان دشمن نظریات کی تشہیر کرتے ہیں۔ کتنے بدقسمت ہیں یہ مفکرین اور

دانشور جو سرمایہ دارانہ حکمراں قوتوں کی خدمت کرتے ہیں! وہ واقعی یقین رکھتے ہیں کہ وہ انسانیت، آزادی، حریت اور سائنس کی خدمت کر رہے ہیں!

اس طرح، بورژوا سائنسییت (bourgeois scientism) کی سپر پاورز کے غلبے کے لیے، مشرق اور مغرب دونوں کو قربان ہونا پڑے گا۔ انہیں منشیات کے ساتھ ساتھ فرائڈیت کا شکار بھی ہونا پڑے گا۔ سائنسییت کے نقطہ نظر سے، ہر وہ نوجوان جو ابھی تک انسان ہے اور جو ابھی تک اپنی قوم اور دوسری اقوام کی تقدیر کے تئیں ہمدردی اور حساسیت دکھاتا ہے، اسے گمراہ کیا جانا چاہیے، اسے اپنی اور دوسروں کی تقدیر کے تئیں لاتعلق بنا دیا جانا چاہیے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے، کوئی بھی ذریعہ جائز اور مشورہ طلب ہے، چاہے وہ سائنس، فن، کھیل، ادب، تاریخ، روایت یا مذہب کی شکل میں ہو۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ انسان کو کسی بھی شکل سے بہلایا جانا چاہیے۔ انسان کو منظر سے ہٹایا جانا چاہیے تاکہ وہ کچھ نہ دیکھے۔ بہترین طریقہ سائنسی اور ذہنی بیوقوفی ہے اور سب سے مضبوط عنصر، خاص طور پر نوجوان نسل کے درمیان، جنس ہے!

جنس کیوں؟ کیونکہ اس کی منطقی وضاحت کی جا سکتی ہے۔ یہ نیا ہے۔ اسے آسانی سے اور آزادانہ طور پر قبول کیا جا سکتا ہے۔ یہ سب سے اہم نکتہ ہے جو نوجوان نسل کو اپنی طرف متوجہ کر سکتا ہے، جو بدلے میں فرائڈیت کا سب سے اہم شکار ہے۔

اس طرح تمام فکری، انسانی، فنکارانہ، سماجی، سیاسی اور مالی سرمایہ کاری کو اس مکتبہ فکر کو مضبوط کرنا چاہیے۔ یہ دیکھنا عجیب نہیں ہے کہ یہ کتنی تیزی سے ترقی کرتا اور پھیلتا ہے۔

یہ نوٹ کیا جانا چاہیے کہ ایک اور گروہ بھی ہے جو نادانستہ طور پر، لیکن انتہائی مؤثر طریقے سے، اس عالمی طاقت کے ساتھ تعاون کرتا ہے تاکہ نوجوان نسل، خاص طور پر خواتین کو فرائڈیت اور جنس کی طرف راغب کرنے کا ہدف حاصل کیا جا سکے۔ یہ گروہ پرانی، سخت، غیر منطقی اور انسان دشمن روایات پر انحصار کرتے ہوئے فرائیڈ کی ایجادات سے اناڑی پن سے لڑتا ہے اور نوجوان نسل، خاص طور پر خواتین میں پابندیاں اور کمپلیکس پیدا کرتا ہے۔ آپ یہ جاننا چاہیں گے کہ وہ اس منحوس کوشش میں کیسے تعاون کرتے ہیں۔ وہ نوجوان نسل کو مایوسی کی طرف دھکیل کر تعاون کرتے ہیں۔

جہاں فرائڈیت عورت کو گھر سے باہر بلاتی ہے، وہیں یہ پرانا گروہ اسے قید، فرائض اور پابندیاں پیدا کر کے اور اسے اس کے تمام انسانی اور مذہبی حقوق سے محروم کر کے اندر رکھنے کی کوشش کرتا ہے، اس طرح لاشعوری طور پر فرائڈیت کے لیے راہ ہموار کرتا ہے۔ اسی طرح وہ فرائیڈ کے ساتھ تعاون کرتے ہیں۔ اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ فرائڈیت کی یہ مضر دعوت روایتی معاشروں اور ممالک میں سب سے زیادہ کامیاب رہی ہے جہاں خواتین سب سے زیادہ محروم رہی ہیں۔ لہذا، ہم اس آفاقی بیماری اور خطرے سے صرف قدیم روایات، رسم و رواج، پابندیوں، بندھنوں وغیرہ پر انحصار کر کے نہیں لڑ سکتے اور مقابلہ نہیں کر سکتے جو خواتین کو حقوق دینے سے انکار کرتے ہیں۔ صرف ایک حل ہے: خواتین کو ان کے انسانی اور اسلامی حقوق واپس دینا۔

جی ہاں! یہی واحد راستہ ہے! اگر خواتین کو ان کے انسانی اور اسلامی حقوق واپس کر دیے جائیں، تو آپ نے انہیں اس ہتھیار سے لیس کر دیا ہے جس سے وہ ذاتی طور پر فرائڈیت کا مقابلہ اور مزاحمت کر سکتی ہیں۔ لیکن اگر آپ انہیں ان کے حقوق سے محروم کرتے ہیں، تو آپ اس بات کو یقینی بناتے ہیں کہ یہ شیطانی دعوت انہیں گرفت میں لے لے۔ آپ نے انہیں اس کی طرف دھکیل دیا ہے۔

ضروری اور اہم مسئلہ جسے ہم نے الجھا دیا ہے، وہ ثقافت اور مذہب کے درمیان فرق ہے۔ ثقافت اور مذہب تاریخ کے دوران ایک دوسرے کے ساتھ مل گئے ہیں۔ یہ خیالات، ذوق، رویوں، احساسات، رسم و رواج اور قانونی تعلقات کا مجموعہ بناتے ہیں جو ایک معاشرے کے لیے مقدس اور قابل احترام ہیں۔

مثال کے طور پر، اسلامی معاشروں میں، اسلامی حقوق، اقدار، احکام اور معیشت، خاندان، برادری اور یہاں تک کہ سماجی نظام سے متعلق قوانین مقامی اور قبائلی روایات کے ساتھ مل گئے ہیں جو صدیوں کے دوران بنی ہیں۔ ان کا یقیناً اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ صرف قدیم قبائلی اور مقامی روایات اور رسم و رواج ہیں جن کی معاشرہ حمایت اور حفاظت کرتا ہے۔ لہذا ایک دانشور جو ایسی قدیم اور مقامی، قبائلی روایات سے رہائی پانا چاہتا ہے اسے دونوں سے آزاد ہونے کے لیے مذہب اور رواج کے امتزاج سے لڑنا ہوگا۔

اس طرح دونوں گروہ (چاہے وہ مذہب کا دفاع کریں یا نہ کریں) قدیم رسم و رواج کے امتزاج کا دفاع کرتے ہیں۔ وہ لوگ جو روایات کے خلاف لڑتے ہیں وہ اسلام کی

زندہ اور صعودی اقدار کا بھی سامنا کرتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی گروہ - نہ ترقی پسند جدید دانشور اور نہ ہی پرانا روایتی مذہبی گروہ - مذہب اور ثقافت میں فرق نہیں کر سکتا۔ انہیں ایک دوسرے سے الگ اور ممیز کیوں ہونا چاہیے؟ کیونکہ ہم مسلمان مانتے ہیں کہ اسلامی حقوق اور قوانین انسانیت کے جوہر اور فطرت کے جوہر سے ماخوذ ہیں اور فطرت کے قوانین کے خالق کی مرضی سے بنائے گئے ہیں۔ فطرت کے قوانین مستحکم ہیں اور کبھی پرانے نہیں ہوتے۔ لہذا، وہ قوانین جو تخلیق کے عمومی وقار پر مبنی ہیں وہ کبھی پرانے نہیں ہوتے۔ اس کے برعکس، پیداوار اور کھپت پر مبنی سماجی روایات (ثقافتی نظاموں پر جو طے شدہ قوانین نہیں ہیں) کو بدلنا پڑتا ہے۔

مذہب، ایک زندہ، مستقل مظہر جو موجودہ دور میں مؤثر ہو سکتا ہے، اب کسی برادری، معاشرے یا نسل کی سماجی زندگی میں مؤثر کردار ادا نہیں کر سکتا کیونکہ مذہب قدیم، زوال پذیر، ٹھوس، منحرف روایات کے ہاتھوں قید ہو چکا ہے اور اس طرح اب سپر پاورز کے خطرے کا مؤثر طریقے سے مقابلہ نہیں کر سکتا۔

ایک باخبر دانشور مورخ، روایت پرست، اسلام شناس، زمانیت کا ماہر اور ماہر سماجیات ہوتا ہے جس کا سب سے اہم ثقافتی مشن اور ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اسلام کو ایک زندہ عقیدے کے طور پر پرانی روایتی سانچوں سے ممیز کرے جو اسلام نہیں بلکہ قبائلی رسم و رواج ہیں اور حقیقی اسلامی نظریات اور عقیدے کو موجودہ دور کی ضروریات سے مطابقت رکھنے والے نئے سانچوں میں ڈالے۔ ابدی، زندہ، متحرک، ترقی پسند اسلامی مواد کی حفاظت کی جانی چاہیے اور انہیں ایسے نئے سانچوں میں ڈالا جانا چاہیے جو ہر دور کے چیلنجوں کا مقابلہ کر سکیں۔

اپنے تجربے کی بنیاد پر مجھے یہ اعلان کرنا ہے کہ حتیٰ کہ سب سے زیادہ ترقی پسند، دانشور، باغی اور انقلابی مفکر بھی جب خالص اسلامی اقدار اور فضیلتوں کا سامنا کرتا ہے (ایک بار جب یہ اقدار موروثی، قبائلی، قدیم، جاہلانہ رسم و رواج سے الگ ہو جائیں) تو وہ ان کی طرف راغب ہو جائے گا اور آسانی سے ان کے سامنے جھک جائے گا۔

فاطمہ (س) کا چہرہ، اس خاتون کا چہرہ جو موجود تھی، جس نے بات کی، جو رہی، جس نے مسجد میں، معاشرے میں، گھر میں اپنے بچوں کی تربیت کرتے ہوئے، اپنے خاندان کی سماجی جدوجہد میں اور اسلام میں کردار ادا کیا - ایک

ایسی خاتون جس کا کردار موجودہ نسلوں کے لیے تمام جہتوں میں واضح کیا جانا چاہیے (نہ صرف مسلمانوں کے لیے بلکہ کسی بھی انسان کے لیے، مرد یا عورت جو انسانی احساسات رکھتا ہو، جو انسانی اقدار پر یقین رکھتا ہو اور جو حقیقی آزادی کا وفادار ہو) اسے موجودہ نسل کے لیے بہترین اور مؤثر ترین ماڈل کے طور پر قبول کیا جانا چاہیے۔

میں نے خود اس کا تجربہ کیا ہے۔ میں نے نام نہاد مذہبی تاریخیں دیکھی ہیں جن میں مذہبی احساسات کی کمی ہے، جنہیں مذہب کے بارے میں کوئی علم نہیں ہے، جو یہاں تک کہ مذہب کی نفی اور مخالفت کرتی ہیں۔ جب پیغمبر اکرم (ص) کے خاندان کی مناسب تصویر ابھرتی ہے، جن سب نے عاجزی اور تسلیم کا مظاہرہ کیا، تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ وہ واقعی زندہ شخصیات ہیں۔

جب میں کہتا ہوں کہ اسلام زندہ ہے، تو میرا مطلب ہے کہ یہ زندہ خیالات اور نظریات کا مجموعہ ہے۔ یہ اپنے زندہ سماجی قوانین اور حقوق کی وجہ سے زندہ ہے۔ یہ زندہ ہے کیونکہ ماڈل، زندہ شخصیات اس کے ذریعے تربیت یافتہ ہیں۔

جب حسین (ع) کی خوبصورت تصویر پیش کی جاتی ہے، جیسے کوئی انسانی معاشرہ (اس بات سے قطع نظر کہ اس کی پیداوار کی شکل کیا ہو، اس بات سے قطع نظر کہ وہ کون سا سماجی نظام استعمال کرتا ہو، اس بات سے قطع نظر کہ وہ کس ثقافتی مرحلے پر ہو) ان کی منفرد اور غیر معمولی شخصیت کا انکار نہیں کر سکتا۔ کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ وہ ایک ابدی انسانی علامت ہیں جن کی پیروی، تعریف اور ستائش کی جانی چاہیے۔ سب انہیں قبول کرتے ہیں۔

کربلا میں زینب (س) کو یاد کرو! اس نے کوفہ کے بازار اور ابن زیاد اور یزید کے درباروں میں اپنی اسیری میں شہادت کے بعد شہادت دیکھنے کے مشکل کام کو برداشت کیا تھا۔

خواتین میں سے کون، چاہے وہ کسی بھی طبقے سے ہو، زندگی کے کسی بھی مرحلے پر ہو، کسی بھی مخصوص قبائلی، مذہبی اور سماجی نظریات کے نظام میں ہو، جو عورت کے ابدی اقدار اور نسوانیت کے صعودی اقدار پر یقین رکھتی ہو، زینب (س) کو خواتین کی سماجی، انسانی اور ترقی پسند قیادت کی ایک مستقل ابدی علامت کے طور پر قبول نہیں کرتی؟

ایسے لوگ زندہ ہیں۔ وہ اسلام کی علامت ہیں۔ زندہ رہنے کا مطلب ہے مؤثر ہونا، صحیح راستہ دکھانا، انسانیت کی رہنمائی کرنا، چاہے وہ کسی بھی مرحلے پر ہو، چاہے وہ کسی بھی سرزمین پر قابض ہو، چاہے اس کا تعلق کسی بھی نسل سے ہو۔

لیکن، بدقسمتی سے، رسم و رواج اور مذہب کو ایک ساتھ ملا دیا گیا ہے۔ رسم و رواج کا یہ امتزاج (جو قابل تبدیلی ہیں اور ایک سماجی، قبائلی اور مقامی نظام سے دوسرے میں مختلف ہوتے ہیں اور معاشی اور سماجی تعلقات سے متعلق اور پیدا کردہ ہیں) اور اسلامی اقدار جو ناقابل تبدیلی، ابدی ہیں اور الہام، وحی اور نبوتی مشن سے متعلق ہیں، کا دفاع مذہب کے نام پر کیا جاتا ہے۔

دانشور، ایک طرف خواتین کی محرومیوں اور زیادتیوں کو دیکھ کر اور دوسری طرف سماجی آزادی، طبقاتی فوائد اور جنسی آزادی کے ظہور کو دیکھ کر الجھن کا شکار ہو جاتا ہے۔

جب کسی برادری کا مذہبی گروہ (جو مذہب سے واقف ہے اور اس پر یقین رکھتا ہے)، مذہب اور مقامی، قبائلی، ثقافتی رسم و رواج کے درمیان فرق کرنے سے قاصر ہو، تو ہم نوجوان، جدید دانشوروں (جو قدیم رسم و رواج کے خلاف لڑنے کے لیے تیار ہیں) سے مذہب اور رسم و رواج کے درمیان فرق کرنے کی توقع کیسے کر سکتے ہیں؟

اگر اسلام کے ممتاز علماء، جو اسلامی سچائیوں سے واقف ہیں، یہ کام نہیں کرتے، تو کون سی تنظیم، کون سی طاقت ایسا کرے گی؟

پیغمبر اسلام (ص) - ایسی بلند شخصیت - جن کے سامنے تاریخ ذلیل ہوتی ہے - جب وہ اپنے گھر میں داخل ہوتے تھے تو مہربان، نرم اور شفیق تھے۔ جب ان کی بیویاں ان سے جھگڑتی تھیں، تو وہ اپنا گھر چھوڑ دیتے تھے اور ان کے خلاف کوئی سخت ردعمل ظاہر کیے بغیر اسٹوریج کے علاقے میں اپنے لیے جگہ بنا لیتے تھے۔

پیغمبر اسلام (ص) کے اس رویے کو ایک اسلامی معیار کے طور پر سمجھا جانا چاہیے نہ کہ کسی فرضی طور پر مذہبی لیکن حقیقت میں بدسلوکی کرنے والے آدمی کے رویے کے طور پر۔ ایسا غیر اسلامی، بدسلوک رویہ ایک نسلی، ثقافتی روایت پر مبنی تھا۔ لہذا، نسلی، ثقافتی رواج اور اسلامی مذہبی حکم کے درمیان فرق کیا جانا چاہیے۔

پیغمبر (ص) کا رویہ اتنا انسانی تھا کہ یہ ہمیں حیران کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر، مدینہ کی کچھ نوجوان لڑکیاں حنین کی جنگ میں حصہ لینے میں دلچسپی رکھتی تھیں، جو مکہ اور جدہ کے درمیان ایک جگہ ہے۔ مدینہ اور مکہ کے درمیان 600 کلومیٹر سے زیادہ کا فاصلہ ہے اور پھر مکہ سے حنین تک کا اضافی فاصلہ ہے۔ اس سفر میں کئی مہینے لگے۔

بہر حال، پیغمبر اسلام (ص) نے پندرہ نوجوان لڑکیوں کے ایک گروپ کو جنگی قافلے کے ساتھ لیا تاکہ وہ جنگی کوششوں میں مدد کر سکیں۔

مدینہ میں پیغمبر (ص) کی مسجد میں، سماجی امور کے لیے ایک برآمدہ استعمال کیا جاتا تھا۔ اس کا ہر کونا ایک سماجی مقصد کے لیے وقف تھا۔ ایک کونے میں رقیہ کا خیمہ تھا جس نے، پیغمبر (ص) کے حکم کے مطابق، پیغمبر (ص) کی مسجد - اسلام کی عبادت گاہ - کے اندر زخمیوں کو ہسپتال میں داخل کرنے، دیکھ بھال کرنے اور نرسنگ کرنے کے لیے ایک خیمہ قائم کیا تھا۔ سعد بن معاذ (خندق کی جنگ میں نیزے سے زخمی ہونے والے اسلامی چیف آفیسر) کو وہاں ہسپتال میں داخل کیا گیا تھا۔ بیمار مریضوں کی دیکھ بھال اور ان کی نرسنگ کرنے کی یہ روایت اسلام میں کئی صدیوں تک جاری رہی۔

میں نے ذاتی طور پر ابن یامین کی کتاب میں اس کے بارے میں پڑھا جس میں اس نے سبزوار کے گورنر علاء الدین کی تعریف کی اور ذکر کیا کہ علاء الدین نے سبزوار کے قریب ایک گاؤں میں جنت جیسے بہت بڑے باغ میں ایک ہسپتال بنایا۔ ہسپتال کو بیان کرتے ہوئے، ابن یامین کہتا ہے کہ وہاں خوبصورت لڑکیاں تھیں، فرشتوں کی طرح، جنہوں نے مریضوں کی دیکھ بھال کی اور ان کی نرسنگ کی....

جب ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری میں سبزوار کے قریب ایک دور افتادہ گاؤں میں ایسا ہسپتال اور عملہ موجود تھا، تو یقیناً رے، طوس، بلخ، بخارا اور بغداد جیسے بڑے شہروں میں اس سے زیادہ اہم اور جدید سہولیات سے آراستہ ہسپتال موجود ہوں گے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے نسلی تعصب کے شکار دانشور یہ اعلان کرتے ہیں کہ پہلی جنگ عظیم میں خدمات انجام دینے والی ایک یورپی یا امریکی خاتون نے دنیا میں نرسنگ کی بنیاد رکھی۔ وہ اسلام کے ابتدائی دور میں کام کرنے والی نرسوں کو نظر انداز کرتے ہیں اور ان کی مخالفت کرتے ہیں، کیونکہ یہ ایک مذہبی روایت ہے۔

اس لیے، آپ دیکھ سکتے ہیں کہ مسائل کو کس طرح گڈ مڈ کیا جاتا ہے، حقوق کو کس طرح ختم کیا جاتا ہے، مذہبی روایات کے نام پر بڑی بڑی صلاحیتوں کو کیسے قربان کیا جاتا ہے، اور کس طرح دانشوری اور روایتی مذہبی عقائد کی مخالفت کے نام پر کتنی عظیم مذہبی اقدار اور اسلامی فضیلتوں کو بھلا دیا جاتا ہے!

اس لیے، ان لوگوں کی ذمہ داری بہت بھاری ہے جو موجودہ معاشرے اور اسلام دونوں کو سمجھتے ہیں (اور جو موجودہ صدی میں رہ رہے ہیں)۔ انہیں کئی صدیوں کے جذبات، خیالات اور عقائد کا بوجھ اٹھانا ہوگا۔ اتنے طویل فاصلے کا سفر کرنا اور اس کے پیچھے چھپی حقیقت کو دریافت کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا، اسلامی معاشروں کو فرائڈ کے نیم سائنسی نظریات کی شیطانی دعوت اور جنسیت کے خوفناک استعمال کے خلاف کھڑے ہونے اور مزاحمت کرنے کے قابل بنانے والے اہم ترین عوامل میں سے ایک، ایک انسانی ثقافت میں مثالی مذہبی نمونوں کی موجودگی ہے۔ جس طرح مغربی عالمی نوآبادیاتی نظام منشیات کے ذریعے اپنے نوجوانوں کے ذہنوں کو مفلوج کر دیتا ہے، اسی طرح مغربی نوآبادیات مشرقی ممالک کے لیے فرائڈیت اور جنسی آزادی کو ڈیزائن اور فروغ دیتی ہے۔ مغرب مشرقی ممالک سے جو خام مال (تیل، ہیرے، سونا، ربڑ وغیرہ) لیتا ہے، اس کے بدلے میں انہیں جنسی آزادی دیتا ہے۔

جب کوئی نوجوان لڑکا یا لڑکی جنسی آزادی سے متعارف ہوتا ہے، تو وہ اس میں مشغول ہو جاتا ہے اور دیگر چیزوں، جیسے آزادی کے مسائل کے بارے میں نہیں سوچتا۔ اور جب ایسے نوجوان پختہ ہو جاتے ہیں، تو وہ قسطوں کی ادائیگی، جنسی جنون وغیرہ میں اتنے الجھ جاتے ہیں کہ وہ کبھی دیگر مسائل پر غور نہیں کرتے!

مغرب کی اس مذموم دعوت کے خلاف اسلامی نوجوانوں کا سب سے اہم ہتھیار ایسی علامتوں کا قبضہ ہے جو ذہن کو حقیقی روحانی تجربات کی طرف لے جاتی ہیں۔ موجودہ نسل جو نہ تو کھوکھلی، قدامت پسند، انسان دشمن اور اسلام مخالف نسلی روایات کے جال میں پھنسنا چاہتی ہے اور نہ ہی غیر اخلاقی مغربی

جدیدیت کی بیوقوف بنانے والی ثقافت میں، اس کے لیے دستیاب روحانی علامتیں مغرب کے حملے کے خلاف بہترین ہتھیار ہیں۔

تیسری دنیا کی خاتون کو ایسی ہونی چاہیے جو انتخاب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ وہ ایسی عورت ہے جو نہ تو موروثی سانچے کو قبول کرتی ہے اور نہ ہی درآمد شدہ جدت کو۔ وہ دونوں کو پہچانتی ہے۔ وہ دونوں سے واقف اور آگاہ ہے۔ وہ چیز جو اسے روایت کے نام پر مسلط کی جاتی ہے، اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ یہ پدری نظام اور غلامی کے دور کے نسلی رواجوں سے متعلق ہے۔ اور جو مغرب سے درآمد کی جاتی ہے، وہ نہ سائنس ہے، نہ انسانیت، نہ حریت اور نہ ہی آزادی۔ یہ خواتین کے لیے تقدس اور احترام پر مبنی نہیں ہے۔ بلکہ یہ بورژوازی کے اوچھے ہتھکنڈوں، بیوقوف بنانے والی صارفیت اور ذہن سے عاری نفس پرستی پر مبنی ہے۔

وہ انتخاب کرنا چاہتی ہے، لیکن کس نمونے کا؟ وہ نہ تو روایتی سخت گیر عورت کا نمونہ چاہتی ہے اور نہ ہی جدید زوال پذیر عورت کا۔ وہ ایک مسلم خاتون کا چہرہ چاہتی ہے۔ خوش قسمتی سے اس تیسری شخصیت کو تعمیر کرنے کے لیے مواد اور تاریخ دونوں دستیاب ہیں۔ اور تاریخ سے بھی زیادہ مستند، سائنسی دلائل سے زیادہ منطقی، وہ عملی مثالی شخصیات ہیں جو ہماری اسلامی تاریخ میں علامت کی حیثیت رکھتی ہیں۔

وہ سب ایک خاندان میں جمع تھے۔ سب ایک چھوٹے سے کمرے میں رہتے تھے— ایک ایسا خاندان، جس کا ہر فرد ایک علامت، ایک نمونہ ہے۔ حسن (ع) جیسا ہونے کا مطلب ہے صبر اور امن کا حامل ہونا۔ حسین (ع) جیسا ہونے کا مطلب ہے خدا کی راہ میں روحانی و مذہبی جدوجہد (جہاد) اور شہادت میں حصہ لینا۔ زینب (ع) جیسا ہونے کا مطلب ہے انصاف اور سچائی کا بھاری سماجی مشن اٹھانا۔ فاطمہ (ع) جیسا ہونے کا مطلب ہے ایک حقیقی عورت ہونا۔ علی (ع) جیسا ہونے کا مطلب ہے متقی ہونا۔

میرا ارادہ نہیں ہے کہ ایک بار پھر فاطمہ (ع) کی زندگی کو بطور نمونہ دہرایا جائے۔ اس سلسلے میں جو کچھ میں جانتا تھا وہ پہلے ہی کہہ اور لکھ چکا ہوں۔ لیکن

میں ایک بار پھر یہ کہنا چاہوں گا کہ صرف تاریخی سوانح عمریوں کو سمجھنا اور دہرانا کافی نہیں ہے۔ ہمیں یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ فاطمہ (ع) کی زندگی کو کیسے بیان کیا جائے، کیسے سمجھا جائے اور اس سے کیسے سبق سیکھا جائے۔

جب پیغمبرِ اسلام (ص) نے فرمایا کہ فاطمہ (ع) دنیا کی چار عظیم ترین خواتین میں سے ایک ہیں، جب انہوں نے ان کی زندگی کے تمام دردوں، مصائب اور پریشانیوں پر انہیں تسلی دی اور یہ اشارہ دیا کہ انہیں دنیا کی خواتین میں سے منتخب کیا جائے گا، تو ان کا مقصد سطحی طور پر سلام کرنا یا جھوٹی تسلی دینا نہیں تھا۔ وہ اس سلسلے میں بالکل سنجیدہ تھے۔ انہوں نے نصیحت کی کہ وہ صبر کریں اور فاطمہ (ع) ہونے کا بھاری بوجھ اور ذمہ داری برداشت کریں۔ فاطمہ (ع) کی بہنوں پر ایسی کوئی ذمہ داری نہیں تھی اور وہ عام مسلم خواتین کی طرح اپنے شوہروں کے ساتھ رہ رہی تھیں۔ لیکن فاطمہ (ع) غیر معمولی تھیں۔ اس لیے پیغمبر (ص) کا انہیں 'سیدہ نساء العالمین' (دنیا کی خواتین کی سردار) کہہ کر مخاطب کرنے کا مقصد نہ تو اپنے پیروکاروں کے لیے کوئی بت بنانا تھا کہ وہ پوجا کریں اور نہ ہی ان کی تعریف بطور ایک مظلوم خاتون کے کرنا تھا تاکہ ان پر نوحہ خوانی کی جائے۔ ان کا مقصد انہیں ایک نمونہ اور علامت کے طور پر پیش کرنا تھا، تاکہ ان کی زندگی کے انداز سے سبق سیکھا جائے اور اس کے مطابق عمل کیا جائے۔ یہی 'سیدہ نساء العالمین' ہونے کا مطلب ہے۔

ہم فاطمہ (ع) کی زندگی سے کیسے سیکھ سکتے ہیں؟ آپ سب ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو جانتے ہیں اور اس لیے یہاں اسے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ واحد نکتہ جو میں بیان کرنا چاہوں گا یہ ہے کہ ہمیں اس عظیم شخصیت سے سیکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

مثال کے طور پر، جب ہم فاطمہ (ع) کی زندگی میں 'فدک' پر غور کرتے ہیں، تو ہمیں دیکھنا چاہیے کہ اس سے ہم کیا سبق سیکھ سکتے ہیں۔ فاطمہ (ع) کا فدک واپس لینے پر اصرار کسی چھوٹے سے کھیت کے حصول کے لیے نہیں تھا۔ ان کی جدوجہد کو اس سطح تک کم نہیں کیا جانا چاہیے۔ ان کی جدوجہد اور کوششیں اس چیز کو حاصل کرنے کے لیے تھیں جسے وہ اپنا حق سمجھتی تھیں، اگرچہ پیغمبر (ص) کے اصحاب نے یہ دکھانے کی کوشش کی کہ ان کی مخالفت اسلامی

معیارات کے مطابق تھی۔ لہذا، فدک کی حقیقی قدر ایک علامت، ایک مثال، ایک دلیل اور ایک مظہر کے طور پر ہے، نہ کہ ایک کھیت کے طور پر۔

آج فدک موجود نہیں ہے۔ کچھ لوگ کہہ سکتے ہیں کہ ایسے تاریخی موضوعات پر اتنا غور اور بحث نہیں کرنی چاہیے، لیکن اس کے بالکل برعکس، میرا ماننا ہے کہ یہ زندہ موضوعات ہیں جنہیں دہرایا اور زیرِ بحث لایا جانا چاہیے، نہ کہ اسکولوں میں پڑھائے جانے والے تاریخی واقعات کے طور پر، بلکہ ایسے موضوعات کے طور پر جن سے قیمتی اسباق حاصل کیے جا سکیں۔

کون سے اسباق؟ اسلامی تاریخ میں مادریت کے بلند ترین مظہر کے بارے میں سبق، فاطمہ (ع) کے بارے میں، گھر، شادی، تعلقات، مادریت، حسن (ع)، حسین (ع) اور زینب (ع) جیسے بچوں کی پرورش، اور شوہر علی (ع) کے ساتھ رفاقت میں ایک عورت کے بلند پایہ نمونے کے بارے میں۔ وہ ایک ایسی عورت تھی جس نے اپنی پوری زندگی میں، اپنے بچپن سے اپنی شادی تک، اپنی شادی سے اپنی زندگی کے اختتام تک، خود کو ایک ذمہ دار، پرعزم انسان سمجھا، جو معاشرے کی تقدیر کا ایک حصہ تھی، جو حق کا دفاع کرتی تھی، سوچ، فکر اور عمل میں انصاف کی حمایت کرتی تھی، اور اپنے معاشرے میں موجود غصب، ظلم اور انحراف کا مقابلہ کرتی تھی۔ وہ اپنی موت تک تمام سماجی مسائل اور ٹکراؤ میں موجود رہی۔ وہ خاموش نہیں رہی، حالانکہ وہ جانتی تھی کہ وہ اس لڑائی میں کامیاب نہیں ہوگی۔ یہ سماجی عزم اور ذمہ داری کا مطلب ہے۔ یہی وہ سبق ہے جو فاطمہ (ع) کی زندگی سے سیکھا جا سکتا ہے۔

جب وہ ابھی دس سال کے قریب چھوٹی سی بچی تھیں، تو وہ ہر جگہ پیغمبرِ اسلام (ص) کے ساتھ مکہ میں جاتیں۔ کسی کو توقع نہیں تھی کہ ایک چھوٹی سی بچی ایسی سماجی، سیاسی اور نظریاتی صورتحال میں اپنے والد کے ساتھ ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلے گی۔ لیکن فاطمہ (ع) اسلامی انقلاب کی منزل کے لیے خود کو ذمہ دار سمجھتی تھیں، حالانکہ اپنی عمر کے لحاظ سے وہ ذمہ دار نہیں تھیں۔ اس لیے وہ ہر ٹکراؤ میں موجود تھیں۔ وہ وہاں موجود تھیں جہاں پیغمبرِ اسلام (ص) دشمن کے سامنے اکیلے تھے۔ وہ ان کے ساتھ کھڑی ہوئیں۔ متعدد واقعات ریکارڈ کیے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر، ایک بار جب پیغمبر (ص) کے دشمنوں نے ایک

بالکونی سے ان کے سر پر دھول ڈالی، تو یہ فاطمہ (ع) ہی تھیں جنہوں نے اپنے چھوٹے ہاتھوں سے پیغمبر (ص) کے چہرے سے دھول صاف کی۔ وہی تھیں جنہوں نے انہیں تسلی دی۔

پیغمبر (ص) اور ان کے اہل بیت تین سال تک ویران وادی (شعبِ ابی طالب) میں جلاوطن رہے۔ سعد بن وقاص (مشہور افسر اور کمانڈر) جیسے ہیرو بھی، کئی سال گزرنے کے بعد، ان دنوں کو یاد کرتے ہوئے خوف سے کانپ اٹھتے تھے۔ اس پورے عرصے میں، جب ناکہ بندی، قید، تذلیل، تنہائی، بھوک اور مشکلات کی پوری ذمہ داری پیغمبر (ص) کے کندھوں پر تھی، فاطمہ (ع) وہاں موجود تھیں۔ اس نے اپنی بوڑھی ماں کو پیار دیا، اپنے ہیرو والد کو سہارا دیا اور یہاں تک کہ اپنی بڑی بہنوں کو بھی تسلی دی! وہ اس خوفناک وادی میں اور ان سخت اور مشکل سالوں میں محبت، مہربانی اور جوش و خروش کا واحد ذریعہ تھیں۔

جب پیغمبر (ص) نے مدینہ ہجرت کی، تو انہوں نے ہجرت کے دور کی مشکلات برداشت کیں۔ یہاں تک کہ علی (ع) سے شادی میں بھی، انہوں نے سماجی ذمہ داری کا مظاہرہ کیا کیونکہ ہر کوئی جانتا تھا کہ علی (ع) گھر کے آدمی نہیں بلکہ میدانِ جنگ کے آدمی ہیں۔ لہذا، اس نقطہ نظر سے وہ ایک مطلوبہ شوہر نہیں تھے جو صرف گھر، لذتوں اور آرام کی تلاش میں ہوں۔ ہر کوئی جانتا تھا کہ علی (ع) کے پاس تلوار اور محبت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ وہ جانتے تھے کہ اپنی زندگی کے آخر تک ان کے پاس کچھ اور نہیں ہوگا۔ فاطمہ (ع) جانتی تھیں کہ علی (ع) کبھی خالی ہاتھوں گھر نہیں لوٹیں گے۔ وہ جانتی تھیں کہ تقدیر کے ہاتھ نے علی (ع) کو ایک آہن (انڈل) کی طرح بنایا ہے جسے تمام ضربوں، اذیتوں اور مشکلات کو برداشت کرنا ہے۔ اس لیے علی (ع) جیسے جنگجو کو شوہر کے طور پر منتخب کر کے، فاطمہ (ع) نے ایک بڑی فکری، انسانی اور سماجی ذمہ داری اپنے کندھوں پر اٹھائی۔

اس لیے فاطمہ (ع) نے شعوری طور پر اپنا انتخاب کیا۔ اس نے اپنی موت تک اس مشن کا بھاری بوجھ شان سے اٹھایا۔ اس نے ایک ایسا گھر بنایا جو تاریخ میں منفرد ہے، انسانی پیمانے اور معیارات سے بالاتر۔ ہر کوئی، چاہے مسلمان ہو یا نہ ہو، تسلیم کرتا ہے کہ ان کا گھر انسانی صورتحال کا ایک نمونہ تھا - ایک ایسا گھر

جس میں علی (ع) والد تھے، فاطمہ (ع) ماں تھیں، حسن (ع) اور حسین (ع) بیٹے تھے اور زینب (ع) بیٹی تھی۔ وہ سب بلند پایہ علامتیں تھیں۔ وہ سب ایک خاندان میں جمع تھے، نہ کہ تاریخ میں منتشر تاکہ انہیں الگ الگ جمع کر کے متعارف کرایا جائے۔ وہ ایک گھر کے اندر ایک نسل تھے۔ ان مسلمانوں کے لیے یہ واقعی تکلیف دہ ہے جن کے پاس ایسے نمونے، ایسا مذہب اور ایسی ثقافت تھی کہ ان کی تقدیر ایسی ہو۔ فاطمہ (ع) جیسی عظیم شخصیت اس خاندان کی رکن تھی۔ وہ ایسی ممتاز خاتون تھیں کہ پیغمبر (ص) کی زوجہ عائشہ نے ان کی تعریف کرتے ہوئے کہا، "میں نے فاطمہ (ع) سے بلند کسی کو نہیں دیکھا، سوائے ان کے والد، پیغمبر (ص) کے۔"

اس لیے کسی بھی دانشور خاتون کے لیے فاطمہ (ع) (یا خدیجہ (ع) یا زینب (ع) جیسی دیگر ممتاز اسلامی خواتین) کے بارے میں کتاب پڑھنا کافی ہے تاکہ وہ ان شخصیات کو پہچان سکیں اور ان کا موازنہ جدیدیت کے نام پر پیش کردہ شخصیات سے کر سکیں۔

جب پیغمبر (ص) نے مدینہ ہجرت کی، تو فاطمہ (ع) نے ہجرت کے دور کی مشکلات برداشت کیں۔ علی (ع) سے شادی میں بھی، انہوں نے سماجی ذمہ داری کا مظاہرہ کیا۔ جو بھی عورت فاطمہ (ع) کا موازنہ جدید رسالوں کے ذریعے متعارف کرائی جانے والی عورتوں سے کرے گی، وہ نمایاں فرق کو پہچان لے گی اور درست اور ناگزیر نتیجے تک پہنچ جائے گی۔

اس لیے باشعور، ذمہ دار مصنفین اور مبلغین کا سب سے اہم فرض یہ ہے کہ وہ ان شخصیات کو موجودہ نسل کے سامنے واضح، روشن، شعوری اور درست طریقے سے پیش کریں، اس طرح مغرب کے حملے کا دفاع کرنے اور مزاحمت کرنے کے لیے انتہائی موثر، باشعور، انسانی نمونے پیش کریں۔

ایک مسلم خاتون کی حقیقی شخصیت جنگِ صفین میں دیکھی جا سکتی ہے - وہ جنگ جو علی (ع) اور معاویہ کے درمیان ہوئی۔ اس جنگ میں، خواتین (جو علی (ع) کی فوج میں تھیں) نے مہاکاوی نظمیں، اشعار گا کر اور حوصلہ افزا تقاریر کر کے، معاویہ کے خلاف علی (ع) کی فوج کو متاثر کیا۔ جنگِ صفین کے بعد اور علی

(ع) کی شہادت کے بعد، معاویہ نے حکم دیا کہ ان خواتین کا تعاقب کیا جائے تاکہ خاندانوں سے بدلہ لیا جا سکے۔ ان خواتین میں سے ایک کو گرفتار کر کے دمشق میں معاویہ کے دربار میں بھیجا گیا۔ معاویہ نے اس سے کہا کہ اس کا ماضی بہت گنہگار ہے۔ اس نے معاویہ کے انتقام سے بچنے کے لیے کہا، "خدا آپ پر رحم کرے۔ ماضی کو نظر انداز کریں۔" لیکن معاویہ نے کہا، "کیا تم جانتی ہو کہ تم نے ہماری فوج کا خون بہایا جب ہم جنگِ صفین میں علی (ع) کی فوج کے ساتھ لڑ رہے تھے؟" اس نے بہادری سے جواب دیا، "خدا کا شکر ہے کہ تم نے مجھے یہ مبارک خبر سنائی [کہ میں تمہاری اور تمہاری فوج کے خلاف اس جنگ میں شریک تھی]۔"

یہ ہے ایک مسلم خاتون کا چہرہ! اگر ہم ان کتابوں کا مطالعہ کریں جو مسلم خواتین کے بارے میں لکھی گئی ہیں، تو ہم دیکھیں گے کہ تاریخ میں جہاں بھی اسلام کی حکمرانی رہی، مسلم خواتین نے سائنس، ادب اور سماجی مسائل میں عظیم ترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ لیکن جہاں بھی اسلامی معاشرے زوال پذیر ہوئے، خواتین بھی زوال پذیر ہوئیں۔ ہمارے دانشوروں کو کبھی زینب (ع) کی زندگی اور شخصیت کا صحیح مطالعہ کرنے اور ان کی حقیقی شخصیت اور کردار کو نوٹ کرنے کا موقع نہیں ملا۔

جب زینب (ع) نے دیکھا کہ انقلاب شروع ہو چکا ہے، تو انہوں نے اپنے خاندان، اپنے شوہر اور اپنے بچوں کو چھوڑ دیا، اور انقلاب میں شامل ہو گئیں۔ وہ اپنے بھائی حسین (ع) کی خاطر، جو اس انقلاب کے رہنما تھے، اس میں شامل نہیں ہوئیں، بلکہ انہوں نے ایسا اپنے معاشرے، اپنے مذہب اور اپنے خدا کے تئیں اپنی ذمہ داری اور عزم کی وجہ سے کیا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ ایک ظالمانہ نظام کے خلاف جدوجہد اور انقلاب شروع ہو چکا ہے، تو وہ انقلاب میں شامل ہو گئیں اور ان مشکل دنوں کے تمام مراحل میں اپنے بھائی حسین (ع) کے ساتھ تھیں۔
حسین (ع) اور ان کے ساتھیوں کی شہادت کے بعد بھی، انہوں نے کربلا کے انقلاب کو جاری رکھنے کا جھنڈا اٹھایا۔ انہوں نے اپنا مشن مکمل، کامل اور منصفانہ طریقے سے انجام دیا۔ انہوں نے طاقت اور ہمت کے ساتھ اپنا مشن انجام دیا۔ انہوں نے الفاظ کے ذریعے وہ سچائی بیان کی جو حسین (ع) نے خون کے ذریعے بیان کی تھی۔ انہوں نے کسی بھی سرزمین پر ظلم کے خلاف آواز اٹھائی۔ انہوں نے جس سرزمین پر قدم رکھا، آزاد یا قیدی کے طور پر، وہاں انقلاب کے بیج بکھیرے، اور یہ کوئی

حادثہ نہیں ہے کہ مسلمان جہاں کہیں بھی ہوں، پیغمبر (ص) کے اہل بیت کے ساتھ بڑی اور گہری ہمدردی ظاہر کرتے ہیں اور ان سے محبت کرتے ہیں۔

یہ زینب (ع) تھیں، پیغمبر (ص) کی پوتی، جنہوں نے حکمران ظالم طاقت کے سامنے کھڑے ہو کر مقابلہ کیا اور تمام مزاحمت کو توڑ دیا۔ انہوں نے یہ سب ایک ظالمانہ خلافت کے خلاف کیا جس نے ایران اور بازنطیم کو فتح کر لیا تھا۔ انہوں نے ہر جگہ اور ہر سرزمین پر حسین (ع) کے انقلاب اور شہادت کے مکتب کے خیالات اور نظریات کو پھیلایا۔ وہ کربلا کے خون کے قطروں کو ہمت اور انصاف کی علامت کے طور پر ہر جگہ اور ہر وقت لے گئیں۔

ہاں! یہ تمام معجزات ایک عورت سے متعلق تھے! اس لیے جب ایک عورت، ایک باشعور اور ذمہ دار، پرعزم عورت فاطمہ (ع) کے خاندان سے تعلق رکھنے والی خاتون سے ایسی بہادریاں دیکھتی ہے، تو وہ سمجھ جاتی ہے کہ اسے کہاں دیکھنا ہے، اسے کیسا ہونا ہے۔ وہ محسوس کرتی ہے کہ کسی بھی دور اور کسی بھی صدی کی عورت اس نمونے کی پیروی کر سکتی ہے۔

یہ وہ اقدار ہیں جو کبھی تبدیل نہیں ہوں گی اور نہ ہی بوڑھی ہوں گی اور نہ ہی یہ سماجی، ثقافتی یا معاشی نظاموں کے رواجوں پر منحصر ہیں۔ یہ مستحکم اور مستقل اقدار ہیں جو تبھی تباہ ہوں گی جب انسانیت کا وجود باقی نہ رہے۔ اس لیے، دورِ حاضر کی خاتون کو یہ جاننا چاہیے کہ فاطمہ (ع) ایک ایسی خاتون تھیں جو اپنے بچپن میں ایک جنگجو تھیں، ایک ایسی خاتون جنہوں نے اقتصادی ناکہ بندی کے سخت دنوں میں صبر اور برداشت کا مظاہرہ کیا، ایک ایسی خاتون جنہوں نے مکہ کی ویران وادی میں تین سال کی قید برداشت کی، ایک ایسی خاتون جنہوں نے اپنی ماں کی وفات کے بعد پیغمبرِ اسلام (ص) کے ساتھ تعاون کیا اور بڑی ہمدردی کا مظاہرہ کیا۔ وہ وہ خاتون تھیں جنہوں نے 'ان کی ماں' کے طور پر کام کیا اور اسی لیے، پیغمبر (ص) کی طرف سے 'ان کے والد کی ماں' کے طور پر مخاطب ہونے کی حقدار ٹھہریں۔ وہ وہ خاتون تھیں جنہوں نے مدینہ میں علی (ع) کی زوجیت اختیار کی، وہ عظیم جنگجو، وہ شخص جس کا انتخاب انہوں نے خود کیا تھا۔ جب انہوں نے علی (ع) سے شادی کی، تو وہ ایک ایسے گھر میں داخل ہوئیں جس میں غربت اور محبت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ پھر علی (ع) کی بیوی

کے طور پر، انہوں نے رفاقت، دوستی، اور بلند ترین روح کی عظیم ترین مثال پیش کی۔ وہ ہمیشہ علی (ع) کے ساتھ ایک بیوی، ایک دوست، ایک ساتھی اور ایک ایسی رازدار کے طور پر موجود رہیں جنہوں نے ان کے رازوں کی حفاظت کی اور ان کی مشکلات کو برداشت کیا۔

اور آخر کار، وہ حسن (ع)، حسین (ع) اور زینب (ع) کی پرورش کرنے والی اور تربیت دینے والی تھیں۔ زینب (ع) کی تربیت میں ان کا حصہ انسانیت کی علامت حسین (ع) سے بھی زیادہ اہم تھا کیونکہ حسین (ع) پیغمبر (ص) کی مسجد کے اندر اور پیغمبر (ص) کے صحابہ کے درمیان پلے بڑھے تھے۔ وہ مدینہ میں ٹکراؤ اور عظیم سماجی واقعات کے مرکز اور عروج پر پلے بڑھے تھے۔ لیکن فاطمہ (ع) نے زینب (ع) کی تربیت اپنے گھر کے اندر اور اپنی گود میں کی تھی۔ کربلا کے انقلاب اور اس کے تسلسل و ترقی میں زینب (ع) کا کردار فاطمہ (ع) کی تعلیم اور زینب (ع) کی بلند روح کا نتیجہ تھا۔

فاطمہ (ع) کے گھر کے ہر کونے سے انسانیت کی ایک علامت اور مظہر ابھرتا ہے۔ پیغمبر (ص) کے خاندان کو ہر دور میں اور ہر وقت اسلامی سمجھ بوجھ کا معیار سمجھا جاتا تھا۔ مدینہ میں پیغمبر (ص) کی فتح کے بعد بھی، فاطمہ (ع) گھر کے باہر غربت، سختی اور مشکلات کی علامت رہیں اور گھر کے اندر بلند ترین معیار کی ماں تھیں۔

اسلام کی فتح اور شان کے عروج پر، جب ان کے والد اسلام کے رہنما تھے، فاطمہ (ع) پھر بھی ایک ایسی عورت کی مثال تھیں جو آپ کی بہن اور میری بہن کی طرح رہتی تھیں۔ انہوں نے ایک غلام کی طرح بھوک برداشت کی۔ انہوں نے اپنے شوہر کی شان اور اپنے والد کی قیادت کے لیے مشکلات برداشت کیں اور محرومیوں کو سہا۔ اور اپنے والد کی وفات کے بعد، جب وہ مشکل دن تجدید پا گئے، تو انہوں نے ایک بار پھر جدوجہد شروع کی۔ بحرانوں کے دوران (جب مدینہ میں پیغمبر (ص) کے تمام صحابہ اور جنگِ بدر، حنین اور احد کے تمام جنگجو خاموش تھے) یہ تنہا ماں اپنی مزاحمت سے باز نہیں آئی۔ انہوں نے اپنی جدوجہد فعال طور پر جاری رکھی۔

یہاں تک کہ راتوں کو بھی وہ پیغمبر (ص) کے صحابہ اور بااثر سیاسی شخصیات کے پاس جاتیں۔ وہ پیغمبر (ص) کے عظیم دوستوں اور اہم شخصیات سے بات کرتیں۔ انہوں نے سب میں شعور بیدار کیا۔ انہوں نے ان سب پر تنقید کی۔ انہوں نے اس آفت کا تجزیہ کیا اور پیش گوئی کی۔ اپنی موت تک اس مرحلے پر یہی ان کا سماجی کردار تھا۔ لیکن اپنی موت کے ساتھ بھی، انہوں نے ایک سیاسی واقعہ پیدا کیا! انہوں نے وصیت کی کہ انہیں رات کے وقت دفن کیا جائے۔ ان کی وفات کے بعد، ان کی یادوں، اعمال اور جدوجہد نے اسلامی تاریخ میں ایک تجدید پیدا کی۔ وہ دوسری سے آٹھویں صدی تک مصر سے ایران تک تمام ممالک میں تمام انقلابی تحریکوں میں انصاف اور سچائی کی تلاش کا مظہر بن گئیں۔ دورِ حاضر میں بھی، وہ مسلم خواتین کے لیے ایک نمونے کے طور پر کام کرتی ہیں: خدا کے پیغمبر (ص) کی بیٹی کے طور پر؛ ایک ماں کے طور پر جس نے زینب (ع) جیسی بیٹی اور حسن (ع) و حسین (ع) جیسے بیٹوں کی تربیت کی؛ ایک بیوی کے طور پر، اپنے شوہر کے لیے ایک بلند، صعودی اور مثالی بیوی کے طور پر؛ اور علی (ع) کی تنہائی، مشکلات اور مصائب میں ساتھی کے طور پر۔ وہ ہر جگہ ایک پرعزم سماجی خاتون کے طور پر ان کے ساتھ تھیں، ایک ایسی عورت جس نے اپنی زندگی کے ابتدائی مراحل سے کبھی اپنے والد کا ساتھ نہیں چھوڑا اور ان کے ساتھ لڑیں اور ان کے ساتھ جدوجہد کی۔ وہ ایسی عورت تھیں جنہوں نے بیرونی محاذ پر ظلم کے خلاف لڑائی کی اور اندرونی محاذ پر انحراف، غصب اور جبر کے خلاف لڑائی کی۔

انہوں نے تنہائی اور خاموشی میں وفات پائی۔ انہوں نے علی (ع) سے وصیت کی کہ انہیں خفیہ طور پر، رات کے وقت دفن کریں۔ یہ ایک ایسی خاتون تھیں جنہوں نے اپنی موت اور تدفین کی تقریب کو بھی حق کی راہ میں جدوجہد کے ایک ذریعہ کے طور پر استعمال کیا۔ موجودہ دور میں ایک مسلم خاتون ہونے کا یہی مطلب ہے۔